بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

# اشارات

انگلستان کے مشہور شاعر ٹینی سن نے ایک شہرۂ آفاق نظم "دی لیڈی آف شیلاٹ" میں ایک ایسی خاتون کی داستانِ حیات قلمبند کی ہے جو ایک جزیرے میں الگ تھلگ انسانی آبادی سے بہت دُور ایک مینار میں مقید تھی۔ اُسے یہ حکم ملا تھا کہ وہ کبھی باہر جھانک کر حقیقت کی دنیا کو دیکھنے کی حماقت نہ کرے ورنہ اس پر ایک زبردست مصیبت نازل ہوگی۔ وہ بیچاری زندگی اور اس کی دلفریبیوں کو اُن آئینوں میں دیکھتی جو اُس کے سامنے ہر وقت آویزاں رہتے اور اس کے جو نقوش اُسے دلکش معلوم ہوتے انہیں وہ کپڑوں میں کاڑھنے کی کوشش کرتی۔

اس عذاب کو وہ بدنصیب کچھ دیر تو برداشت کرتی رہی لیکن ایک دن اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور اُس نے حیاتِ انسانی کا آئینوں میں نہیں بلکہ عالمِ واقعات میں مشاہدہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اُس نے جس لمحہ حقیقت کی دنیا پر ایک نظر دوڑائی تو جو آئینے سامنے معلق تھے وہ سب چکنا چور ہوگئے اور خود اُس کی اپنی زندگی کا چراغ گل ہوگیا۔

---

نوعِ انسانی عذاب کی جن مختلف اقسام سے آشنا ہے اُن میں ایک قسم یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کو عوامی زندگی کا سب سے زیادہ رازداں ہونا چاہیے وہ اُس سے سب سے زیادہ بے تعلق ہوجائیں۔ وہ انسانی احساسات و جذبات سے بہت دُور ایک ایسی رنگین فضا میں وقت گزارنے کے عادی بن جائیں جہاں زندگی کے حقائق انہیں اپنے اصل رنگ روپ میں نظر نہ آنے پائیں۔ انہیں اوّل تو اپنے عیش و آرام سے فرصت نہ ملے

کہ وہ زندگی کی تلخیوں کا جائزہ لے سکیں اور اگر کبھی وہ اس کا عزم بھی کریں تو چاپلوسوں کا ایک جم غفیر انہیں حقیقتِ حال تک پہنچنے نہ دے۔ وہ اُن کے سامنے رنگ رنگ کے آئینے آویزاں کر دے جن میں دیکھنے سے انہیں ہر آن صرف یہی نظر آتا رہے کہ "حضور کا اقبال ترقی پر ہے، دشمن اپنی موت مر رہا ہے۔ عوام خوشحال ہیں اور ہر نفس حضور کی سلامتی اور درازئ عمر کے لیے دعا گو ہے۔ لوگوں کو کوئی تکلیف اور پریشانی نہیں، انہیں اگر کوئی اضطراب ہے تو صرف یہی کہ کہیں حضور خدانخواستہ رنجیدہ خاطر نہ ہوں کیونکہ اُن کی زندگیاں تو حضور کے ساتھ وابستہ ہیں"

---

چاپلوسوں اور خوشامدی لوگوں کی یہ مدح سرائی درحقیقت برسرِ اقتدار گروہ کے لیے سب سے بڑی آزمائش اور سب سے زیادہ خوفناک فتنہ ہے۔ جس طرح بدنصیب لیڈی آف شیلاٹ رنگا رنگ کے آئینوں میں گھر کر حقائق سے ناآشنا رہی بالکل اسی طرح ملک و ملت کے بااختیار لوگ تعریف و توصیف کے ان ہوائی قلعوں میں آباد ہو کر زندگی اور اُس کے اصل مسائل سے یکسر غافل ہو جاتے ہیں۔ بے جا مدح سرائی کرنے والے خود غرض لوگ انہیں اتنا موقع ہی نہیں دیتے کہ وہ حیاتِ انسانی کا صحیح طور پر مطالعہ کر سکیں۔ لوگ فاقے مرتے ہیں اور چاپلوسوں کا طائفہ انہیں یہ باور کراتا ہے کہ وہ خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ملک کا امن غارت ہوتا ہے اور عوام چیختے چلاتے ہیں اور ہر طرف سے نالہ و فریاد کی صدائیں بلند ہوتی ہیں لیکن یہ حکمراں طبقہ کے دل و دماغ میں اس باطل خیال کو بٹھانے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ ایک چھوٹے سے فتنہ پرداز گروہ کی فتنہ سامانیاں ہیں جو آپ کے سکونِ خاطر کو درہم برہم کرنے کا ناپاک عزم رکھتا ہے ورنہ لوگ تو ہر طرح عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور اُن کی زبانیں آپ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ لوگوں کے اخلاق بگڑتے ہیں، اُن کے اندر احساسِ شکست اور قنوطیت جیسے مہلک امراض پھیلتے ہیں۔ وہ بیچارے

خود غرضی، تعصب، تنگ نظری کا شکار ہوتے ہیں لیکن یہ چالاک اور عیار لوگ برسر اقتدار گروہ کو قوم کے اس انحطاط سے یکسر غافل رکھتے ہیں اور انہیں ہر طرح سے یہ یقین دلاتے ہیں کہ ملت اُن کی قیادت و سیادت میں ہر لحاظ سے قابلِ تعریف ترقی کر رہی ہے اور کسی شخص کو کسی قسم کا کوئی گلہ شکوہ نہیں۔ یہ چند مخالف آوازیں جو کبھی کبھی جناب کے کانوں میں پڑتی ہیں وہ ایسے دشمنوں کی ہیں جو کسی صورت میں بھی آپ کے خیر خواہ نہیں ہو سکتے۔ یہ آپ کے ازلی بدخواہ ہیں جو آپ کے جاہ و مال اور عزت و وقار کو حاسدانہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اس طرح کی باتیں کرنے سے اُن کا مقصد بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ وہ آپ کی ہر آن بڑھتی ہوئی شہرت کو داغدار کریں۔ ان کی تنقید تعمیری نہیں بلکہ تخریبی ہے اور آپ کو ان کی بیہودہ باتوں پر قطعاً دھیان نہ دینا چاہیے۔

---

تعریف و توصیف کا یہ عظیم فتنہ اگرچہ حکمران گروہ کو مسند اقتدار سنبھالنے کے ساتھ ہی گھیرے میں لے لیتا ہے لیکن آغاز میں اس کے نتائج اتنے خوفناک نہیں ہوتے جتنے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برسرِ اقتدار طبقہ بلاشبہ اوّل روز سے ہی زندگی کو رنگین آئینوں ہی میں سے دیکھتا ہے۔ وہ آئینے جو اس کے مصاحبین اُس کے سامنے آویزاں رکھتے ہیں لیکن کچھ مدت تک جذبات و احساسات کے اعتبار سے یہ لوگ انسان ہی رہتے ہیں۔ ایک بے حس قوتِ قاہرہ میں ڈھلنے نہیں پاتے۔ فاقہ کشی، افلاس، دکھ، بے روزگاری اور بیماری کے عملی مضمرات سے وہ بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ اُن کے سامنے جب یہ بات لائی جاتی ہے کہ ملک کے اندر اتنی تعداد میں لوگ روٹی کے لقموں تک سے محتاج ہیں تو اُن کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں کرب و اضطراب کی ویسی ہی ٹیسیں اٹھتی ہیں جیسے ایک مفلوک الحال شخص اپنے بچوں کو فاقے مرتے دیکھ کر محسوس کرتا ہے۔ انہیں جب یہ کہا جاتا ہے کہ اس سرزمین میں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جن کے سامنے اُن کے عزیز و اقارب بیماری کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دیتے ہیں لیکن وہ علاج معالجہ

کے لیے ایک پائی بھی صرف نہیں کر سکتے تو اس افسوسناک اطلاع سے انہیں دلی صدمہ پہنچتا ہے وہ جب اغوا اور قتل کے روح فرسا واقعات سنتے ہیں تو اُن کا خون اسی طرح کھولتا ہے جس طرح ایک صاحب دل انسان کا کھولنا چاہیے۔ سوسائٹی کے بے لگام طبقوں کی چیرہ دستیوں کے حالات معلوم کر کے ان کے اندر نفرت و حقارت کا وہی جذبہ اُبھرتا ہے جو ایک صحیح دل و دماغ رکھنے والے آدمی کو بے چین اور بیتاب کرتا ہے۔ عوامی زندگی گو اُن کی نظروں سے اوجھل ہوتی ہے لیکن جذبات و احساسات سے اوجھل نہیں ہوتی۔ مشترک انسانیت کا احساس ان کے دلوں میں ارتعاش پیدا کرتا ہے اور وہ معاشرہ میں ظلم و ستم کی گرم بازاری دیکھ کر کبھی کبھی خون کے آنسو بھی بہا دیتے ہیں اور صورتِ حال کو بدلنے کے لیے امکانی حد تک جدوجہد کرتے ہیں

---

انسانی دکھ درد کا یہ احساس بڑا قابل قدر ہے اور اسے انسان کی روحانی اور اخلاقی صحت کی سب سے بڑی ضمانت کہا جا سکتا ہے لیکن ایک صاحبِ اقتدار کے لیے جتنا یہ احساس ضروری ہے اتنا ہی اسے مٹانے اور ختم کرنے کا التزام بھی کیا گیا ہے۔ اس مقدس جذبہ کا سب سے بڑا دشمن خود انسان کا اپنا نفس ہے۔ یہ جذبہ چونکہ انسان کے ضمیر کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر اسے بیدار کرتا ہے، اس لیے نفس نے اسے سلانے کی سب سے زیادہ کوشش کی ہے تاکہ انسان کا ذہن کسی قسم کی کوئی خلش محسوس نہ کرے اور وہ بے فکر ہو کر، دنیا اور اس کی پریشانیوں سے بالکل الگ تھلگ رہ کر آرام و آسائش کی زندگی بسر کر سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انسان نے عجیب و غریب قسم کے نظریات گھڑے ہیں۔ "تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو" کا عافیت پسندانہ تصور بھی ایسی خود غرضانہ ذہنیت کی غمازی کرتا ہے۔

---

یہ عافیت پسندانہ طرزِ زندگی اپنے مزاج کے اعتبار سے یونہی بڑی جاذبِ نظر ہے

لیکن یہ اُن لوگوں کے لیے اپنے اندر غیر معمولی کشش کا سامان رکھتا ہے جن کے ہاتھ میں اقتدار کی وجہ سے بے پناہ قوت منتقل ہو جاتی ہے، جو پورے ملک کی دولت کے امین قرار پاتے ہیں۔ وہ حضرات جنہیں نہ صرف ذاتی نفع و نقصان، بلکہ پوری قوم کے سود و زیاں کا ذمہ دار ٹھیرایا گیا ہے اور جن سے اس بات کی بجا طور پر توقع ہو کہ وہ اُس قوم کے رکھوالے ہوں گے اُس کے دکھوں کو اپنے دکھ سمجھیں گے اور اُس کی پریشانیوں کو ذاتی پریشانیاں خیال کریں گے۔ وہ اگر اپنے احساسات کو اس حد تک زندہ رکھیں کہ خلفائے راشدین کی طرح ہر جاندار کا دکھ درد اُن کے دلوں کے اندر ارتعاش پیدا کر دے، تو پھر وہ مسند اقتدار پر متمکن ہو کر دادِ عیش نہیں دے سکتے بلکہ اپنے سروں پر کانٹوں کا تاج پہنا لیتے ہیں جو انہیں ہر لمحہ بے چین رکھتا ہے جن لوگوں نے اقتدار کے تخت پر بیٹھ کر مشترک انسانیت کے احساس کو مٹنے نہیں دیا بلکہ اُس کے اندر قوت و طاقت پیدا کی ہے، انہوں نے با اختیار بن کر عیش و تنعّم کی زندگی اختیار نہیں کی بلکہ شاہی میں فقیری کا روشن اور تابناک مسلک اپنایا ہے

---

انسانی تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ دورِ اقتدار میں جس قوم نے مشترک انسانیت کے ان بیش قیمت احساسات کی سب سے زیادہ حفاظت و پاسبانی کی ہے وہ امّتِ مُسلمہ ہے۔ اسلام نے سب سے پہلے حاکم و محکوم کے درمیان اُس مصنوعی فرق کو ختم کر دیا ہے جو دنیا کے با اقتدار لوگوں نے اپنے عیش و آرام کے لیے قائم رکھا ہے۔ اسلام امیر کو غیر مسئول اقتدار عطا نہیں کرتا بلکہ اُسے اپنے ہر قول اور فعل کے لیے خدا اور خلق دونوں کے سامنے جواب دہ ٹھیراتا ہے۔ دوسرے وہ حاکم کو قانون سے بلند و بالا نہیں سمجھتا بلکہ اُسے بھی اسلامی قانون کا اُسی طرح پابند قرار دیتا ہے جس طرح کہ عام لوگوں پر اُس کی اطاعت فرض ہے۔ مسلمانوں کے اندر جب تک اسلامی ریاست کے ان دو بنیادی اصولوں کا احترام موجود رہا اُن کے حکام نے اپنے آپ کو انسان ہی سمجھا اور کبھی مافوق البشر ہونے کا دعویٰ نہ کیا۔ وہ عام انسانوں کی طرح رعایا

کے درمیان رہے، اُن کے دکھ درد میں برابر شریک ہوتے رہے، اُن کے مصائب اور تکلیفات کو اُسی شدت کے ساتھ محسوس کرتے رہے جس شدت کے ساتھ انسان اپنی پریشانیوں کو محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ اُن کے اس صحت مندانہ طرزِ عمل کی وجہ سے اُن کے اندر احساسات کی شمعیں اُسی طرح روشن رہیں جس طرح ایک حساس انسان کے اندر روشن ہوتی ہیں۔ شدتِ احساس کی وجہ سے ان کے دل غموں کے ہجوم میں گھرے رہتے ہیں لیکن انہوں نے طبیعت کی اس افسردگی کو، جو مال و متاع کی کمیابی کی وجہ سے نہیں، بلکہ دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہو کر انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے، مسرت و نشاط سے ہمیشہ عزیز تر رکھا۔

ناصبوری ہے زندگی دل کی
آہ وہ دل کہ ناصبور نہیں

دل کی یہ ناصبوری قلب و احساس کے زندہ ہونے کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ اس کی مدد سے ایک انسان دوسرے انسان کی قلبی واردات و کیفیات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، وہ اپنے دل کے ہاتھوں ہی اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ نوعِ بشری سے محبت کرنا سیکھے، اُس کے دکھوں کی چوٹ سہنے کی اپنے اندر ہمت و طاقت پیدا کرے اور پھر ان دکھوں کے مداوا کے لیے اپنی جان تک کی بازی لگا دے۔ جس دل میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے یوں سمجھیے کہ اُس نے حیاتِ انسانی کے اصل راز کو پا لیا۔ ایسا شخص بزدلوں کی طرح مسندِ اقتدار کو گوشۂ عافیت نہیں سمجھتا جس میں بیٹھ کر سکون اور آرام کے ساتھ انسانیت کی بربادیوں کا ایک غیر متعلق تماشائی کی طرح نظارہ کیا جا سکے بلکہ اُس شخص کا دلِ بیتاب اُسے اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ زندگی کے اس متلاطم سمندر میں، جہاں انسانیت کو ہر آن مصائب کے تھپیڑے لگ رہے ہیں، بے خطر کود پڑے اور زخموں سے چور انسان کو اُن سے نجات دلائے۔

---

یہ جذبِ اندرون کوئی شاعرانہ سوز نہیں جو انسان کو محض غم کی تصویر بنا کر رکھ دے اور اس

طرح اُس کے فکری اور عملی قویٰ کو بالکل معطل و مفلوج بنا دے۔ یہ "سوزِ دروں" فکر و عمل کا سب سے زبردست محرک ہے۔ اس سوز کے تحت افراد انسانیت اور اُس کے مسائل پر بڑی ہمدردی کے ساتھ غور و فکر کرتے ہیں اور پھر اپنے نتائجِ فکر سے انسانیت کو علمی اعتبار سے مالامال بھی کرتے ہیں۔ یہ سوز اُن کے اندر ایثار، ہمدردی، بے نفسی اور بصیرت پیدا کرتا ہے۔ یہ اُن کے اندر ایک ایسے لافانی اور مقدس احساس کی پرورش کرتا ہے جو انہیں ہر لمحہ اُن کے فرائض سے آگاہ رکھتا ہے اور انہیں بتاتا ہے کہ وہ جب تک دوسروں کی تکلیفات کو اپنی تکلیفات پر مقدم نہیں رکھتے۔ اس وقت وہ اُس فرض سے صحیح معنوں میں سبکدوش نہیں ہو سکتے جو ایک انسان کی حیثیت سے اُن پر عائد ہوتا ہے اس بنا پر یہ سوز انسان دوستی اور فرض شناسی کی سب سے مضبوط اور مستحکم بنیاد ہے۔

---

پھر اس احساس سے اگر ایک طرف انسان کے دل و دماغ میں وسعت پیدا ہوتی ہے تو دوسری طرف اُس کے اندر یہ جذبہ بھی نشوونما پاتا ہے کہ وہ دوسروں کی غلطیوں اور قصوروں کو فیاضی کے ساتھ جانچے اور ایک سخت گیر قاضی کی طرح ان پر حکم لگانے کی بجائے ایک اہلِ دل انسان کی طرح ان کی وجہ اور علت معلوم کرنے کی کوشش کرے یعنی اُسے چور کو پکڑنے اور سزا دینے سے کہیں زیادہ اس بات کی فکر دامنگیر ہو کہ وہ اُن اسباب کا کھوج لگائے جنہوں نے اس شخص کو سیدھے راستے سے ہٹ کر گناہ کے راستے پر ڈال دیا ہے یہ احساس اُن کے اندر عجز پیدا کرتا ہے اور وہ اپنی نیکی، پرہیزگاری، خدا ترسی اور قوتِ عمل کو اپنی ذاتی جدوجہد پر محمول نہیں کرتے بلکہ اُن کے سامنے ہر آن یہ خیال موجود رہتا ہے کہ یہ محض خداوند تعالیٰ کی عنایت اور نوازش ہے کہ انہیں صحیح طرزِ فکر اور شریفانہ طرزِ عمل کی توفیق نصیب ہوئی، ورنہ اگر فضلِ الٰہی شاملِ حال نہ ہوتا تو کیا عجب وہ بھی انہیں برائیوں میں ملوث ہوتے جن برائیوں میں اُس کے بدنصیب بھائی گرفتار ہیں۔ جب کوئی شخص اپنے

اندر اس قسم کے احساسات و جذبات پالتا رہے تو اس کے اندر وہ مشترک انسانیت کا احساس قوت پکڑتا ہے جس کے بغیر بسا اوقات کم ظرف انسان نیکی کے غرہ میں انسانی ہمدردی اور انکسار جیسی بلند صفات کھو بیٹھتے ہیں۔

افضل البشر بعد الانبیا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خوفِ خدا، تقویٰ و طہارت کو کون نہیں جانتا لیکن اُس پاکباز انسان کی دلی کیفیات کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ ایک چڑیا کو درخت پر بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس کو خطاب کر کے فرمانے لگے:

"اے چڑیا تو کس قدر خوش نصیب ہے، درختوں کے پھل کھاتی ہے اور ٹھنڈی چھاؤں میں خوش رہتی ہے۔ پھر موت کے بعد تو وہاں جائے گی جہاں تجھ سے باز پرس نہیں ہوگی۔ اے کاش ابوبکر بھی اسی قدر خوش نصیب ہوتا۔

کبھی یہ ارشاد فرماتے:

"اے کاش میں رہگذر پر ایک درخت ہوتا، اونٹ وہاں سے گزرتا، مجھ کو پکڑتا۔ اپنا منہ مجھ پر مارتا، مجھ کو چباتا اور اس طرح میری تحقیر کرتا . . . یہ سب کچھ ہوتا مگر میں بشر نہ ہوتا"[1]

حضرت ابوبکر صدیق کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسندِ اقتدار کی ذمہ داریوں کو کما حقہ ادا فرمایا۔ اُن کی آنکھوں سے یہ حقیقت ایک لمحہ کے لیے بھی اوجھل نہ ہونے پائی کہ یہ اقتدار عیش و آرام کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک زبردست آزمائش ہے۔ جب اُن پر حملہ کیا گیا تو لوگ اس روح فرسا خبر سن کر اُن کے پاس آتے۔ وہ اُن کو خراجِ تحسین پیش کرتے انہیں الوداع کہتے اور امیر المومنین کے لقب سے مخاطب کرتے۔ اس پر انھوں نے فرمایا:

"کیا تم امارت کو میرا توشۂ آخرت بنا رہے ہو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں زندگی کا ایک دور گزارا، اور جب رفیقِ اعلیٰ

[1] کنز العمال بر مسند امام احمد ج ۴ ص ۳۶۱

نے انہیں اپنے پاس واپس بلا لیا تو وہ مجھ سے خوش تھے۔ اس کے بعد مجھے حضرت ابوبکر صدیق کی رفاقت کا شرف نصیب ہوا۔ آخرکار وہ بھی وفات پا گئے۔ میں آخر دم تک اُن کا تابع فرمان رہا۔ لیکن اب تمہاری یہ امارت ہی میرے لیے خوف کا سبب بن گئی ہے جو میری تعریف و توصیف کر کے مجھے بہکانا چاہتا ہے وہ فریب خوردہ ہے۔ خدا کی قسم! میری تو یہ خواہش ہے کہ جیسا یہاں آیا تھا ویسا ہی یہاں سے چلا جاؤں۔ نہ مجھے کچھ دینا ہو نہ لینا ہو۔"

روایت ہے کہ انہوں نے ایک تنکے کی طرف ہاتھ بڑھایا جو اُن کے بستر کے قریب زمین پر پڑا تھا اور اُسے اٹھا کر اپنی آنکھوں کے سامنے رکھ کر کہنے لگے کاش میں یہ تنکا ہوتا، کاش میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ کاش! میری ماں مجھے نہ جنتی۔ کاش میں کچھ بھی نہ ہوتا۔ کاش میں نسیًا منسیًا ہوتا۔

---

رعایا کے دکھ درد اور تکلیفات کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس قدر احساس تھا کہ وہ معمولی سے معمولی تکلیف سن کر بھی سخت بے چین ہو جاتے اور اس بات کے لیے مسلسل کوشاں رہتے کہ اُن کا یہ احساس خلافت کی ذمہ داریوں کے ساتھ بڑھتا چلا جائے۔ اسی لیے وہ عوام کے ساتھ گھل مل کر رہے۔ اُن کے مسائل کو ایک حساس، فرض شناس اور صاحب دل انسان کی طرح سمجھنے کی کوشش کی اور پھر اُن کے حل کرنے کے لیے پوری ہمت اور لیاقت کے ساتھ جدوجہد بھی کی۔ اُن کی حیات کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ روم و شام پر فوجیں بھیج رہے ہیں، قیصر و کسریٰ کے سفیروں سے مُلکی سطح پر گفتگو فرما رہے ہیں۔ حضرت خالد بن ولیدؓ اور امیر معاویہؓ سے بازپرس کر رہے ہیں، سعد بن ابی وقاص، ابوموسیٰ اشعری، عمروؓ بن العاص کے نام اہم احکام لکھوا رہے ہیں لیکن دوسری طرف بدن پر بارہ پیوند کا کرتا پہن رکھا ہے، سر پر پھٹا سا عمامہ ہے، پاؤں میں پھٹی ہوئی جوتیاں ہیں

پھر اس حالت میں یا تو کاندھے پر مشک ہے کہ بیوہ عورتوں کے گھر پانی پہنچا دیں یا مسجد کے کسی کونے میں فرشِ خاک پر لیٹے ہوئے آرام فرما رہے ہیں۔

ایک دفعہ خطبہ میں کہا کہ صاحبو! ایک زمانہ میں میں اس قدر نادار تھا کہ لوگوں کو پانی بھر کر لا دیا کرتا تھا اور وہ میری اس محنت کے صلے میں مجھے خشک کھجوریں دیا کرتے تھے اور اسی پر میں بسر اوقات کرتا۔ یہ کہہ کر منبر سے اتر آئے۔ لوگوں کو تعجب ہوا کہ یہ منبر پر کہنے کی کیا بات تھی۔ فرمایا کہ میری طبیعت میں ذرا غرور آگیا تھا۔ یہ اس کی دوا تھی۔

۱۸ھ میں قحط پڑا۔ اس وقت حضرت عمرؓ کی بیقراری قابل دید تھی۔ عبادت اور سیادت کی پوری تاریخ میں اس کی نظیر ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ خلیفہ ثانی نے گوشت گھی اور تمام دوسری مرغوب غذائیں ترک فرما دیں۔ ایک دن اپنے بیٹے کے ہاتھ میں خربوزہ دیکھا تو سخت خفا ہوئے۔ فرمانے لگے "مسلمان بھوک کے مر رہے ہیں اور تم میوے کھا رہے ہو۔" گھی کی بجائے زیتون کا استعمال شروع کر دیا اور اس کے مسلسل استعمال سے ایک روز شکم مبارک میں درد ہونے لگا۔ آپ نے پیٹ میں انگلی چبھو کر فرمایا "جب تک ملک میں قحط ہے یہی کچھ ملے گا۔"

عکرمہ بن خالد کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے ایک وفد نے مل کر عرض کیا کہ آنجناب ذرا بہتر کھانا کھایا کریں تو اللہ تعالیٰ کے کام کرنے کے لیے آپ کے اندر زیادہ قوت و توانائی پیدا ہو جائے گی۔ آپ نے دریافت فرمایا: کیا یہ تمہاری ذاتی رائے ہے یا سب مسلمان اس کا تقاضا کرتے ہیں؟ عرض کیا گیا یہ سب مسلمانوں کے دل کی آواز ہے۔ فرمایا: "میں تمہاری خیرخواہی کے لیے ممنون ہوں مگر میں اپنے پیش رووں کی شاہراہ ترک نہیں کر سکتا۔ مجھے ان کی ہم نشینی یہاں کی لذتوں سے مرغوب ہے۔"

جو لوگ محاذِ جنگ پر ہوتے آپ ان کے گھروں میں تشریف لے جاتے اور عورتوں سے پوچھ کر انہیں بازار سے سودا سلف خرید کر لا دیتے۔ اہلِ فوج کے خطوط آتے تو خود

گھروں میں پھر کر پہنچاتے جس گھر میں کوئی پڑھا لکھا نہ ہوتا وہاں خود ہی چوکھٹ پر بیٹھ جاتے اور گھر والے جو کچھ لکھاتے لکھ دیتے۔

---

خلافت کی ذمہ داریوں کے بارے میں ان کے احساسات جس قدر نازک تھے اُن کا اندازہ اُن الفاظ سے کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے وفات کے وقت ارشاد فرمائے۔

حضرت عمرؓ اپنے لخت جگر حضرت عبدؓ اللہ کو اپنی تجہیز و تکفین کے متعلق وصیت فرما رہے تھے کہ اُن کے جنازے کے ساتھ عورتیں نہ چلیں، اور اُن کی تعریف میں وہ باتیں نہ کہی جائیں جو اُن میں نہیں ہیں۔ اس لیے کہ اللہ انہیں زیادہ جانتا ہے۔ ابھی آپ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکل ہی رہے تھے کہ آپ نے محسوس کیا کہ اب لقائے ربانی کا وقت بالکل قریب آگیا ہے۔ اس حالت میں بیٹے سے فرمایا میرا رخسار زمین پر رکھ دو! حضرت عبداللہ نے آبدیدہ ہو کر کہا: ابا! کیا میرے زانو اور زمین میں کوئی فرق ہے؟ فرمایا "تیری ماں نہ رہے میرا رخسار زمین پر رکھ دو۔ جب بیٹے نے باپ کا رخسار زمین پر ٹکا دیا تو اپنے دونوں پاؤں ملاتے اور فرمانے لگے، افسوس ہے، مجھ پر اور میری ماں پر! اگر مجھے اللہ نے معاف نہ کیا" وہ یہی فقرہ بار بار دہراتے رہے تا آنکہ روح نے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا۔

---

یہ سب واقعات جن کی حیثیت مشتے نمونہ از خروارے کی سی ہے اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ ایک حساس اور فرض شناس انسان خلافت کی ذمہ داریوں کو کس طرح محسوس کرتا ہے اور پھر اُن سے کس اخلاص کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ حضور سرورِ کائنات نے اس سلسلہ میں ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

| | |
|---|---|
| من ولی من امر المسلمین | جس شخص کو مسلمانوں کی زمام کار سونپی گئی اور |
| شیئًا ثم لم یحطھم بنصحہ کما یحوط | اُس نے اس فرض کو اُس جذبۂ خیر خواہی سے |

اهل بيته فلم يتبوأ مقعده من النار ۔ سرانجام دینے میں کوتاہی کی جس سے کہ وہ اہل خانہ کے معاملات انجام دیتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنالے ۔

اس حکیمانہ قول میں رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک امیر کی ذمہ داریوں کو بڑی عمدگی سے بیان فرمایا ہے۔ انسان کی سرشت میں یہ چیز داخل ہے کہ وہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی دقتوں اور پریشانیوں کو سب سے زیادہ جانتا ہے اور انہیں بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ حضورؐ نے اس سلسلہ میں امیر کو یہ بات ذہن نشین کرائی ہے کہ "من و تو" کی تفریق کی وجہ سے انسانی احساسات میں جو فرق واقع ہو جاتا ہے اس سے امیر کو حتی الامکان بالا ہونا چاہیے اور اسے لوگوں کے معاملات کو اسی دلسوزی، دلچسپی اور توجہ سے حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جس سے وہ اپنے ذاتی معاملات حل کرتا ہے۔ دوسرے اس ارشاد کے اندر اس تعلقِ خاطر کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے جو اسلام خلیفہ اور رعایا کے درمیان قائم کرنا چاہتا ہے جس طرح باپ اور بیٹے کے درمیان، اور میاں اور بیوی کے درمیان تعلقات ہر قسم کے تکلفات سے پاک ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح خلیفہ کا اپنی رعایا کے ساتھ تعلق بھی ہر قسم کی بناوٹ سے پاک ہونا چاہیے۔ حاکم اور محکوم کے درمیان جو مصنوعی حجابات حائل ہیں وہ اسلام کی نظر میں سخت ناپسندیدہ ہیں۔ خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ باپ کی طرح اپنی اولاد یعنی رعایا کی مشکلات کو اچھی طرح جاننے کی کوشش کرے اور پھر باپ کی سی تڑپ اور بیقراری کے ساتھ انہیں دور کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ راعی اور رعیت کے درمیان بُعد اور دُوری کا جو تصور دنیا میں موجود ہے وہ شیطان کے دماغ کی کرشمہ سازی ہے۔ حضور سرورِ کائنات اور ان کے جلیل القدر خلفاء نے اپنے طرزِ عمل سے اسے دنیا سے نیست و نابود کر کے رکھ دیا۔ خلفائے راشدین عام لوگوں کی طرح ایک سیدھی سادھی، ہر قسم کے تکلفات سے پاک زندگی بسر کرتے، لوگوں سے محبت کے ساتھ ملتے، ان کے مسائل سمجھتے اور پھر

انہیں حل کرتے۔ اُن کے ہاں نہ کوئی چوبدار ہوتے تھے جو اُن کی تشریف آوری کے وقت ہٹو، بچو کی آوازیں لگاتے۔ ان کی زندگی میں انتہائی بے ساختہ پن تھا۔ حضرت عمرؓ کا یہ معمول تھا کہ وہ ہر نماز جمعہ کے بعد صحنِ مسجد میں بیٹھ جاتے اور جس کو جو کچھ اُن سے کہنا اور سننا ہوتا بلاتکلف کہتا۔ کوئی نہ ہوتا تو تھوڑی دیر انتظار کر کے تشریف لے جاتے۔ نہ ہی رعایا سپاسناموں اور پُرتکلف دعوتوں میں اُن کے قیمتی اوقات کو ضائع کرتی اور نہ ہی وہ رعایا کے معاملات کو دفتری پیچیدگیوں میں اُلجھا کر اُس کی پریشانی کا باعث بنتے۔ امورِ سلطنت محبت، تدبّر اور بے تکلفی کی ایسی فضا میں طے ہوتے جس میں کہ ایک خاندان کے معاملات طے کیے جاتے ہیں۔

---

رعایا سے الگ تھلگ رہنے کا رجحان، اور اس کے معاملات کو لیڈی آف شیلاٹ کی طرح مصاحبین کے فراہم کردہ آئینوں میں دیکھنے کی عادت اور پھر عوام کے ساتھ تمرّد و استکبار کا رویّہ یہ سب چیزیں اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی ہیں۔ انسان کے اندر سے جو جذبہ ان کی آبیاری کرتا ہے اُس کا خمیر خود غرضی، انانیت اور ہوس کاری سے اُٹھایا گیا ہے اور فریب خوردہ عقل نے ان غلط اور گمراہ کن افکار و اعمال کے جواز کے لیے بھی بعض بڑے عجیب و غریب نظریات گھڑ لیے ہیں۔ یونانی ادب میں دیوتاؤں کا جو تصور موجود ہے وہ یہ ہے کہ ایک مافوق البشر مخلوق انسانی آبادی سے بہت دور اُونچے پہاڑوں پر عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ انسانوں کی حیثیت اُس کے نزدیک محض کھلونوں کی سی ہے۔ دیوتا جب ترنگ میں آتے ہیں تو انسانی آبادیوں پر بلاتکلف بجلیاں گراتے ہیں جن سے لاکھوں انسان نیست و نابود ہوتے ہیں۔ کبھی وہ انسانوں کے درمیان جنگ و جدال اور قتل و غارت شروع کرا دیتے ہیں اور کبھی سمندروں میں جہازوں کے ڈوبنے کا سامان کرتے ہیں۔ انسان جب ان مصائب سے گھبرا کر چیختے اور چلاتے ہیں تو دیوتا اُن کی اس آہ و فغاں میں چنگ و رباب کی سی لذت محسوس کرتے ہیں۔ وہ انسانی نالوں پر تھرکتے اور ناچتے ہیں۔

مغربی اقوام نے اپنے ملکی انتظامات میں تو اس تصور سے کوئی خاص فائدہ نہ اٹھایا البتہ جب وہ استعماری عزائم کے ساتھ مشرقی ممالک کو تاخت و تاراج کرنے کے لیے نکلیں تو پھر جن لوگوں کو ان بدنصیب ممالک کی زمام کار سونپی گئی انہیں یونانی دیوتاؤں کی سی زندگی بسر کرنے کی تلقین کی۔ ہمارے ہاں سول سروس میں جن انگریزوں کو بھیجا جاتا رہا ہے وہ اپنے مزاج اور احساسات کے اعتبار سے بالکل بے حس لوگ تھے اور اسی بے حسی کو اُن کی استعدادِ کار کا سب سے بڑا معیار ٹھیرایا گیا۔ ملک میں سے بڑی تگ و دو کے ساتھ وہ لوگ منتخب کیے گئے جن کے دل مشرقی اقوام کے خلاف پہلے ہی حقارت کے جذبات سے لبریز تھے اور پھر انہیں باقاعدہ تربیت کے ذریعہ ظالم اور سفاک بنانے کی کوشش کی گئی اور اس امر کا پورا التزام کیا گیا کہ اگر کسی انگریز کے پہلو میں اس ریاضت کے بعد بھی احساس کی کوئی رمق باقی رہ گئی ہے تو اسے مشرق میں قدم نہ رکھنے دیا جائے۔ کیونکہ استعمار پسند اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ مشترک انسانیت کا احساس بیدار ہونے کے بعد کوئی صاحبِ دل شخص وہ مظالم نہیں ڈھا سکتا جو مشرقی اقوام پر ڈھانے مقصود تھے

---

مغرب کے بعض مفکرین نے اس غیر انسانی اور ظالمانہ طرزِ عمل کے لیے کچھ دلائل بھی فراہم کیے ہیں۔ ان میں ایک دلیل یہ ہے کہ ایک صاحبِ اقتدار انسانی احساسات و جذبات سے جس قدر عاری ہوگا اتنے ہی اس کے فیصلے محکم اور بے لاگ ہونگے۔ یہ بات بظاہر بڑی معقول معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں جذبات و احساسات کے عمل دخل کو نہایت ہی غلط رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک بااختیار آدمی کو کسی وقتی تاثر سے اس قدر مغلوب نہ ہونا چاہیے کہ اس کی فکری اور عملی صلاحیتیں بالکل ٹھٹھر کر رہ جائیں لیکن وہ جب تک بے اختیار اور بے زبان لوگوں کی مشکلات کو دل کی گہرائیوں سے محسوس نہیں کرتا وہ کوئی موثر قدم نہیں اٹھا سکتا۔ جذبہ و احساس کے بغیر وہ جو قدم بھی اٹھائے گا وہ

میکانکی نقطۂ نظر سے تو بالکل صحیح ہوگا لیکن انسانیت کے زاویۂ نگاہ سے اُس کی صحت ہمیشہ محلِ نظر رہے گی۔ انسانی آبادیوں کو کبھی علمِ طبعیات اور علم کیمیا کی تجربہ گاہوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ انسان وہاں ہر قسم کے احساسات سے عاری ہو کر بے جان چیزوں کے بارے میں تلاش و جستجو کرتا ہے۔ انسان جب عقل و احساس کا مجموعہ ہے تو لازمی طور پر اس کے متعلق فیصلہ کرنے میں بھی دونوں کا عمل دخل ضروری ہے۔ اس بنا پر ایک حاکم کا فرض ہے کہ وہ صاحبِ دل انسان کی طرح رعایا کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرے اور پھر مشین کی سی بے حسی کے ساتھ نہیں، بلکہ ایک حساس اور فرض شناس انسان کی سی ہمدردی اور ذہانت کے ساتھ اُس پر حکم لگائے۔ نضیر نامی ایک شخص تھا جو حضور سرورِ کائنات اور مسلمانوں کو سخت ایذا دیا کرتا تھا۔ فتح مکہ کے بعد جب حضور شہر میں داخل ہوئے تو ایک مجمع عام میں آپ نے حضرت علی مرتضیٰ کو حکم دیا کہ اس بدبخت کی گردن اُڑا دو۔ ذوالفقار حیدری نے ایک آن میں اُس کم بخت کا خاتمہ کر دیا۔ نضیر کی لاش خاک و خون میں تڑپ رہی تھی لیکن وہ ہستی جس کی آنکھوں میں دوشیزہ لڑکیوں سے بھی زیادہ حیا تھی، جس کا قلب تاثراتِ لطیفہ کا سرچشمہ تھا۔ اس دردانگیز منظر سے مطلق متاثر نہ ہوئی۔ نضیر کی بیٹی نے باپ کے قتل کی خبر سنی تو نوحہ و فریاد کرتی اور باپ کی جدائی میں دردانگیز اشعار پڑھتی ہوئی دربارِ نبوی میں حاضر ہوئی۔ اللہ اکبر! اشعار سنے تو اس قدر متاثر ہوئے کہ اس لڑکی کے ساتھ مل کر رونے لگے۔ یہاں تک کہ جوشِ ہمدردی نے اُس سب سے زیادہ ضبط کرنے والے انسان کے سینے سے ایک آہِ سرد نکلوا کر چھوڑی۔ پھر نضیر کی تڑپتی ہوئی لاش کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: "یہ فعل محمد رسول اللہ کا ہے" اور اپنی اشکبار آنکھ پر انگلی رکھ کر کہا "یہ فعل محمد بن عبداللہ کا ہے" پھر حکم دیا کہ نضیر کے بعد کوئی شخص مکہ میں قتل نہ کیا جائے گا۔[1]

یہ ہے وہ طریق جس سے احساسِ فرض اور مشترک انسانیت کے احساس کو نہ صرف ایک دل میں جمع کیا جا سکتا ہے بلکہ ان کے درمیان صحیح طور پر توازن بھی قائم رکھا جا سکتا ہے۔

[1] مکاتیبِ اقبال

ایک حاکم جب تک شبنم کی لطافت کے ساتھ سورج کی حرارت اور شیشہ کی نزاکت کے ساتھ پتھر کی سختی اپنے اندر پیدا نہیں کرتا وہ کبھی بھی اپنے فرائض کی بجا آوری میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک حاکم کو صاحب دل اور صاحبِ احساس ہونا چاہیے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ رعایا کے اخلاقی عیوب اور برائیوں کے ساتھ بھی سمجھوتہ کرنے کو تیار ہو جائے اور جرم اور گناہ کے ساتھ رواداری برتے۔ نہیں اسے جرم اور مجرم میں، گناہ اور گناہ کرنے والے میں تمیز کرنی چاہیے۔ ایک بااختیار انسان کی حیثیت سے اس کا فرض ہے کہ وہ جرم کے تدارک کی پوری کوشش کرے اور اس کے استیصال کے لیے اپنی ساری قوتیں صرف کر دے لیکن بحیثیت ایک انسان اسے مجرموں کے ساتھ ہمدردی اور محبت رکھنی چاہیے۔ احساسِ فرض اور انسانی ہمدردی کے مابین صحیح توازن خدا پر پختہ یقین و ایمان اور اس کی مخلوق کے ساتھ لازوال محبت ہی سے پیدا ہوتا ہے اور اس کی پرورش مسلمان کے دل کے علاوہ اور کہیں نہیں ہو سکتی۔

---

وہ لوگ جو حصولِ اقتدار کو ذاتی عیش و آرام کا ذریعہ سمجھتے ہوں اُن کے لیے اس سے بڑی مصیبت اور کوئی نہیں کہ وہ لوگوں میں گھوم پھر کر نہ صرف اُن کی تکلیفات کے متعلق صحیح قسم کی اطلاعات حاصل کریں بلکہ اُن کی شدت کو ایک اہلِ دل انسان کی طرح محسوس بھی کریں۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلموں کے ہاں کسی بلند و بالا شخصیت کا تصور ہمیشہ یہی رہا ہے کہ وہ عام لوگوں سے الگ کوئی آسمانی مخلوق ہے۔ کفارِ مکہ نے حضور سرورِ عالم کی حیاتِ طیبہ کے متعلق جو مختلف قسم کے اعتراضات کیے اُن میں ایک اعتراض یہ تھا کہ یہ عجیب پیغمبر ہے جو عام لوگوں کی طرح کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں اپنی ضرورت کی چیزیں حاصل کرنے کے لیے بڑی بے تکلفی کے ساتھ چلتا پھرتا بھی ہے۔ زندگی کا یہ فطری انداز اُن لوگوں کے لیے حیران کُن تھا جن کی نظریں ہر قیصر و کسریٰ کے شاہانہ ٹھاٹھ دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں اُن کے

ذہن اس بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوتے کہ کوئی شخص مقدس رسول بھی ہو اور وہ عام لوگوں کے ساتھ مل جل کر زندگی بھی بسر کرے۔

---

حضور سرورِ کائنات اور اُن کے جلیل القدر رفقاء کار نے اپنے طرزِ عمل سے اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ حقیقی عظمت کا راز لوگوں سے الگ تھلگ رہنے میں مضمر نہیں بلکہ اُن کے ساتھ ملنے جلنے، ان کے دکھ درد میں شریک ہونے اور پھر ان کا مداوا کرنے میں مضمر ہے عظیم لوگ نہ تو نمود و نمائش سے اپنی شخصیت کا رعب لوگوں کے دلوں میں بٹھاتے ہیں اور نہ ہی انتخاب کے امیدواروں کی طرح مصنوعی اور جھوٹے انکسار سے کام لیکر اُن کے دلوں کو مفتوح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بلا شبہ عوام میں زندگی بسر کرتے ہیں لیکن سیرت و کردار کی رفعتوں سے نیچے اتر کر عوامی سطح پر نہیں آجاتے، بلکہ دوسروں کو اپنی سطح تک بلند کرنے کے لیے جد و جہد کرتے ہیں کیونکہ ان کی انسانیت کے ساتھ محبت مصلحتِ وقت پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ ان کے مقدس جذبات اور فطری احساسات کا اظہار ہوتی ہے۔ بڑا انسان ہو کر ایک عام انسان کی طرح زندگی بسر کرنا اور عوام کے دلوں کی دھڑکنوں کو اپنے کانوں سے سننا اور پھر محسوس کرنا بہت مشکل کام ہے اور یہ کام وہی سرانجام دے سکتا ہے جو صحیح معنوں میں ایک عظیم اور غیر معمولی شخصیت کا مالک ہو۔ ایسے شخص کو اپنی عظمت کا لوہا منوانے کے لیے نہ تو خسروانہ جلال کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی غیر مسئول اقتدار کی۔ وہ نہ ہی سیاسی ناموں کا محتاج ہوتا ہے اور نہ ہی اپنی تصاویر کی نمائش کا۔ لوگوں کے دل ان تدبیروں کے اختیار کیے بغیر ہی اُس کے احترام سے معمور رہتے ہیں۔ اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے ایک موقع پر خلیفہ ثانی رضؓ نے ایک بڑی حکیمانہ بات ارشاد فرمائی:

رجل اذا کان امیرھم کانہ رجل منھم واذا لم یکن امیرھم کانہ امیرھم۔

مجھ کو ایسا شخص درکار ہے کہ جب مسلمانوں کا امیر ہو تو ایسا معلوم ہو کہ گویا وہ انہی میں کا ایک ہے لیکن جب امیر نہ ہو تو (اپنے کمالات و اوصاف کی وجہ سے) اُن لوگوں کا امیر ہی معلوم ہوتا ہو۔